جڑوں کی تلاش

دیپک بُدکی

A-102، ایس۔جی امپریشن، سیکٹر B-4، وسندھرا، غازی آباد (یوپی)، موبائل: 9868271199

وہ اپنی جڑوں کی تلاش میں نکل پڑی تھی۔ وادی کا یہ اس کا پہلا سفر تھا۔ حال ہی میں اس نے ایک معروف ٹی وی چینل میں بطور رپورٹر جوائن کر لیا تھا۔ کشمیر کے حوالے سے چینل پر اکثر ہو رہے مباحث نے اس کے تجسس کو مہمیز لگائی تھی۔

اس کی ماتاجی اٹھتے بیٹھتے اپنی دھرتی کی باتیں کیا کرتی تھیں۔ 'کشمیر، کشمیر' کی رٹ لگاتے بے چاری کا دم نکل گیا۔ کئی بار ماں نے اپنا آبائی مکان دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، مگر نہ تو حالات ایسے تھے اور نہ اس کی صحت ایسی تھی کہ وادی کی سیر کرنے کے لیے لے جاتے۔ پھر اچانک ایک روز ان کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں۔

ماں کو بچھڑے ہوئے قریباً پانچ سال ہو گئے۔ دمِ احتضار کی اس کی تڑپ کو دیکھ کر شیتل نے ارادہ کیا کہ وہ ایک بار اپنے آبائی وطن کو دیکھنے ضرور جائے گی۔ اب تو قسمت نے بھی یاوری کی تھی۔ ذاکر حسین کالج آف ماس کمیونیکیشن، دہلی سے جرنلزم کی پوسٹ گریجویٹ ڈگری حاصل کر کے اس کی تقرری انٹرنیشنل ٹیلی ویژن (آئی ٹی وی) میں بہ حیثیت رپورٹر ہوئی تھی۔ اس تقرری سے اس کو ایک عجیب سی مسرت ملی تھی۔ وہ بچپن ہی سے لاابالی قسم کی لڑکی تھی جو ایک آزاد، خود بین اور خود کفیل زندگی بسر کرنا چاہتی تھی۔ جب بھی وہ بین الاقوامی جرنلسٹوں کو جوکھم اٹھاتے ہوئے لڑائی کے میدانوں سے رپورٹنگ کرتے دیکھتی تو مچل اٹھتی اور چاہتی کہ کبھی وہ بھی افغانستان، سیریا، فلسطین اور بغداد کے شورش زدہ علاقوں سے چینل کے لیے اپنی کہانیاں بھیج دے۔ اس آزادروی کا سبب اس کے والدین کا روشن ذہن اور مثبت فکر تھا۔ والد نے کبھی بھی اس کو یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ لڑکی ہے، لڑکوں سے کم تر ہے یا پھر کسی سماجی حصار میں بندھی ہوئی ہے۔ اس کی اڑان میں والد کی حوصلہ افزائی کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔

شیتل کا جنم سوپور، کشمیر میں ایک متمول گھرانے میں ہوا تھا۔ اس کی ماں کہتی تھی کہ وہاں ان کی جائیداد آج کے حساب سے دو تین کروڑ کی تھی۔ سیبوں کے باغات، اخروٹ اور بادام کے درخت، دھان کے کھیت اور سنگِ سبز و دیودار کا نقش و نگار کیا ہوا چار منزلہ مکان جس کی باہر کو نکلی ہوئی کثیر الاضلاع بالکونیاں صناعی کی بہترین شاہکار تھیں۔ مکان میں کئی کمروں کی 'ختم بند' چھتیں لکڑی کے چھوٹے چھوٹے مسطح ٹکڑوں کو آپس میں جوڑ کر بنائی گئی تھیں۔ ایسی کاریگری تو اب شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ وہ تو خود دو چار دن کی بچّی تھی کہ اس کے والدین وادی چھوڑ کر جموں آنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ افسوس اس ساری دولت کا کیا فائدہ کہ دھری کی دھری رہ گئی اور سارے کنبے کو راشن اور مائیگرنٹ ریلیف کی لائنوں میں کھڑا ہونا پڑا جب تک ان کے پوسٹ آفس اور بینک اکاؤنٹس ٹرانسفر ہو کر آ گئے۔ بہت عرصہ بعد وہ اپنی جائیداد بھی اونے پونے داموں بیچنے میں کامیاب ہو گئے کیونکہ کئی برسوں تک مائیگرنٹوں کی جائیداد خریدنے پر پابندی لگی ہوئی تھی۔

پتاجی نے اپنی زندگی میں رنگ، نسل اور مذہبی بھید بھاؤ کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ ان کے سامنے نہ کوئی چھوٹا تھا نہ بڑا، سب کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے اور کبھی کسی سے بُرا برتاؤ نہیں کرتے۔ کئی بار لوگوں کو یہ مغالطہ ہوتا کہ وہ ہندو ہیں یا مسلمان؟ نامساعد حالات کی وجہ سے انھیں وادی کو خیرباد کہنا پڑا تاہم ان کو پورا یقین تھا کہ یہ بارودی کلچر زیادہ دیر نہیں ٹِک پائے گا، حالات جلد سدھر جائیں گے اور سب مہاجر اپنی دھرتی کو لوٹ جائیں گے۔ ایسا سوچتے سوچتے اب بائیس سال ہو گئے تھے۔

ماتاجی تو پتاجی سے بھی زیادہ جذباتی تھیں۔ جب بھی موقع ملتا، اپنے ماضی کو کریدتیں، وطن کی گلیوں، کوچوں اور میدانوں کو یاد کرتیں جن میں وہ رسی کودا کرتی تھیں یا پھر کنچے، کھوکھو، پٹھو گرم، آنکھ مچولی یا پھر چھپن چھپائی کھیلا کرتی تھیں۔ کبھی کبھار انھیں لگتا کہ وہ اپنے چمن زار میں بیٹھی وہاں کا منظر بیان کر رہی ہیں۔ ان کا میکہ بارہمولہ میں تھا۔ وہاں کے بارے میں یوں بیان کرتیں:

''میرا میکہ وتستا کے کنارے واقع تھا، کھڑکی سے باہر نظر ڈالتی تو

آہستہ روو تستا کا نظارہ بہت ہی خوشنما لگتا تھا۔ دریا پار دوسرے کنارے پر گنیش جی کا خوبصورت مندر دعوت نظارہ دیتا... پھر افق تا افق پہاڑوں کا سلسلہ... برف سے اٹے ہوئے... نیلے نیلے، اودے اودے پہاڑ... دامن چیڑ اور دیودار کے درختوں سے بھرا ہوا... ہر طرف ہریالی ہی ہریالی... صبح سویرے ایک جانب مسجدوں سے اذانیں گونجتیں اور دوسری جانب مندروں کی گھنٹیاں سنائی دیتیں۔ محلے میں بہت سے گھر تھے، جو نزدیک تھے وہ ایک دوسرے کی خیر خبر رکھتے۔ ہندو مسلم سب ایک دوسرے سے گھل مل کر رہتے۔ ہمارے گھر کے سامنے بہت بڑا آنگن تھا جس میں ایک چنار کا درخت اپنی شاہانہ عظمت کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کی عمر اندازاً ڈیڑھ سو سال تھی۔ تین بادام کے پیڑ اور دو اخروٹ کے درخت بھی تھے۔ بہار کی آمد پر بادام کے پیڑوں پر دلفریب شگوفے لگ جاتے اور پھر بادام بننے شروع ہو جاتے۔ ہم ان کچّے باداموں کو کھانے کے لیے اتاؤلے ہو جاتے اور جونہی کہیں نظر آتے لپک کر منہ میں ڈالتے۔ البتہ اخروٹوں کے لیے بہت انتظار کرنا پڑتا تھا۔ گرمیوں کے اخیر میں پک جاتے۔''

بچپن کی ان بھولی بسری باتوں کا ذکر کرتے ہوئے ہیمال کی آنکھیں نم ہو جاتیں خاص کر جب وہ چنار کے بارے میں کچھ بتلاتیں۔

''وہ چنار نہیں تھا، بلکہ ہماری دھرو ہر تھی۔ والدین سے سنا تھا کہ اس کو میرے دادا نے اس وقت لگایا تھا جب اس کی امید بر آئی تھی اور اس کی شادی اپنی بچپن کی ہمجولی سے ہوئی تھی۔ دادا جی نے شادی کے ترنت بعد نشانی کے طور پر وہ چنار کا پودا لگایا تھا۔ پھر تو عجیب سی روایت قائم ہوگئی۔ گھر کی کنواری لڑکیاں چپکے سے اس چنار سے منت مانگتیں کہ انھیں بھی اپنے پریمی سے ملا دے۔''

ہیمال نے بھی اس چنار سے کئی بار منت مانگی تھی۔

وقت کے ساتھ ساتھ معصومیت کے وہ منظر غائب ہو گئے اور وہ سادہ لوح لوگ بھی کہیں کھو گئے۔ سب کچھ دھیرے دھیرے اوجھل ہوتا گیا۔ کوئی عفریت انھیں یوں چھین کر لے گیا جیسے کوئی کوّا کسی معصوم بچے کے ہاتھ سے جھپٹ کر اس کے منہ کا نوالہ چھین لے جاتا ہے۔

ہیمال اور ناگرائے کا ملن بھی عشق کی ایک عجیب داستاں تھی۔ ناگرائے نے بی اے، بی ایڈ کی تعلیم حاصل کر لی تھی اور ریاستی حکومت نے اسے بارہمولہ کے ایک اسکول میں بحیثیت استاد کے تعینات کیا تھا۔ ان دنوں نقل وحمل کے ذرائع بہت محدود تھے اس لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ گھر سے روزانہ اسکول آ جا سکے۔ جون کی پہلی تاریخ تھی۔ اس نے اسکول میں اپنی جوائننگ رپورٹ ڈال دی اور پھر ایک مقامی استاد نے اپنی ذمہ داری پر اسے ہیمال کے گھر میں ٹھہرایا۔ وہ زمانہ ہی مختلف تھا۔ کرایہ یا کرایہ دار نام کی کوئی چیز کسی نے نہ سنی تھی نہ دیکھی۔ لوگوں میں تجارتی ذہن ابھی پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ مالک مکان کی دو بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ بیٹیوں میں سے ایک کا نام ہیمال تھا۔

ہیمال نے مقامی اسکول سے دسویں کی تعلیم حاصل کر کے پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ اب دن بھر گھر میں یا پھر کھیتوں میں کام کرتی تھی۔ گھر میں زیادہ تر جلوہ گر نہیں ہوتی تھی البتہ صبح سویرے جب ناگرائے دھان کے کھیتوں میں سے شارٹ کٹ کر کے اسکول جاتا تھا تو وہ اکثر اسے وہاں مسکراتی ہوئی ملتی۔ واپسی پر وہ دریا کنارے یا کسی پیڑ کے نیچے ستاتی ہوئی دکھائی دیتی۔ گھر میں بھی کبھی کبھی آمنا سامنا ہو جاتا تھا۔ ناگرائے کو البتہ یہ خدشہ رہتا کہ اگر اس سے کوئی ایسی ویسی حرکت سرزد ہوگئی جس سے ہیمال کے والدین کو شک ہو جائے تو اسے نہ صرف گھر سے نکالا جائے گا بلکہ بدنامی کے سبب اسے پوری بستی میں پھر کہیں رہنے کو کمرہ نہیں ملے گا۔ دراصل جس مقامی ٹیچر نے ناگرائے کے لیے کمرے کا بندوبست کیا تھا اس نے خبردار بھی کیا تھا کہ مالک مکان کی دو خوبصورت لڑکیاں ہیں اور بستی چھوٹی سی ہے اس لیے کوئی غلط حرکت کی تو بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل جائے گی اور پھر منہ دکھانے کے قابل نہ رہ جاؤ گے۔ اس تنبیہ نے ناگرائے پر الٹا ہی اثر کیا تھا۔ اس کے دل میں جستجو کی نامعلوم سی چنگاری پیدا ہوگئی تھی۔

ہیمال پہلے ہی دن اس کو دیکھ کر دل دے بیٹھی تھی۔ اتنا خوبرو نوجوان اسے کہاں ملتا۔ وہ سوچنے لگی کہ شاید بھگوان نے ناگرائے کو اسی کے لیے آسمان سے گرا کر اس کی جھولی میں پھینک دیا ہے۔ ہیمال کا کنبہ مکان کی دو منزلوں میں رہتا تھا جب کہ ناگرائے کو تیسری منزل پر دو کمرے اور رسوئی دے رکھی تھی۔ وہاں پر وہ بیچارہ روزانہ اپنے لیے بھات، آلو اور ترکاریاں بنا کر گزارا کرتا۔ کچھ دنوں پہلے ہی خوش قسمتی سے کیروسین پر جلنے والا اسٹوو مارکیٹ میں آ چکا تھا اور ناگرائے نے اپنا ناشتہ اور کھانا بنانے کے لیے ایک اسٹوو خرید لیا تھا۔ گجر دم نزدیک والے مندر میں چلا جاتا اور واپسی پر نانبائی سے دو روٹیاں اور گوالے سے آدھ سیر دودھ لے آتا۔ کبھی کبھار دہی کا موڈ بن جاتا تو اسی وقت خرید کے رکھ لیتا۔ ان دنوں کشمیر میں نہ فین ہوتے تھے اور نہ ریفریجریٹر۔ معتدل موسم کے باعث کچی پکی سبزیاں کئی کئی دن رکھی رہتی تھیں اور سڑنے کا نام نہیں لیتی تھیں۔ کئی بار ہیمال کا دل چاہا کہ ناگرائے کی غیر حاضری میں اس کے

گھر کا سارا کام کرلے اور جب وہ شام کو لوٹے تو سب کچھ قرینے سے رکھا ہوا پا کر حیران ہو جائے۔

زندگی کتنی سادگی اور سرلتا سے گزر جاتی تھی۔ کہیں کوئی پیچیدگی نہ تھی۔ ناگرائے لباس بھی سادہ ہی پہن لیتا تھا۔ چوڑی دار پاجامہ، قمیص اور آستین دار گرم پٹّو کا کوٹ پہن کر اسکول جاتا۔ سر پر پگڑی باندھ لیتا جس کو باندھنے میں کم سے کم دس پندرہ منٹ لگ جاتے تھے۔ البتہ گھر میں کرتا پاجامہ اور پھرن پہن لیتا تھا۔ شدید سردی ہوتی تو سویٹر، کن ٹوپ اور دستانے بھی استعمال کر لیتا تھا۔ موسم سرما میں دو مہینے کی چھٹیاں ہوتیں اور ان دنوں اپنے گھر سوپور چلا جاتا۔ اس سمے ہیمال کو ایک دن ایک سال کے برابر لگتا۔ وہ اس علیحدگی کو برداشت نہیں کر پاتی تھی۔ دن بھر حبہ خاتون اور ارنی مال کے گیت گایا کرتی جن کے ہر شعر میں ہجر اور انتظار کی بازگشت سنائی دیتی تھی۔

دھیرے دھیرے ناگرائے مکان مالک اور اس کی بیوی کے ساتھ گھل مل گیا۔ وہ ان کی فیملی کا ایک فرد بن گیا۔ وہ لوگ بھی اس کی خبر گیری کرنے لگے۔ پہلے پہل وہ کسی سے زیادہ بات نہیں کرتا تھا یہاں تک کہ ایک روز مکان مالک نے اپنی بیوی سے پوچھ لیا، ''ماسٹر جی کا کچھ حال چال تو معلوم کیا کرو۔''

جواب ملا۔ ''خاک حال چال معلوم کروں۔ وہ تو نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا ہے۔ چلتا پھرتا پتھر کا مجسمہ لگتا ہے۔ نہ بات نہ چیت۔ آتے جاتے کسی کو نمسکار بھی نہیں۔ جانے کیسے سنسکار دیے ہیں اس کو اپنے ماں باپ نے۔''

مکان مالک اپنی ہنسی نہ روک سکا۔ پھر بولا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں۔ دراصل وہ بہت ہی شرمیلا ہے۔ سوچتا ہوگا کسی سے بات کروں کہیں وہ برا نہ مان جائے۔''

مگر ہیمال کی بات دوسری تھی۔ اس پر تو جوبن برس رہا تھا۔ وہ ہر دم کسی بہانے کی تلاش میں رہتی تھی تاکہ ناگرائے سے بات کر سکے۔ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو ہی جاتی تھی۔ بات کرتے سمے اس کے چہرے پر بجلیاں کوند جاتیں، ہونٹ کپکپا اٹھتے اور سارا وجود ملتجی نظر آتا۔ والدین کی نظر بچا کر اس نے ناگرائے کے لیے اُون کا سویٹر بُن لیا اور ایک روز سیڑھی پر ناگرائے کو روک کر بنا کچھ کہے سنے اس کو تھما دیا۔ ناگرائے ہکا بکا رہ گیا۔ سمجھ نہیں آیا کیا ردِعمل ظاہر کرے۔ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا گیا اور پیکٹ کو کھول کر دیکھ لیا۔ اس کے اندر ایک خط ملا جس میں دوسری باتوں کے علاوہ لکھا تھا کہ ''کب سے سہیلی کے گھر میں چوری چھپے یہ سویٹر آپ کے لیے بُن رہی تھی۔ کل رات مکمل ہوگئی اور آج آپ کو سونپ رہی ہوں۔ میرے پیار کا حقیر سا تحفہ سمجھ کر پہن لینا۔ جب کبھی میری یاد آیا کرے تو اس سے باتیں کیا کرنا۔''

ناگرائے مخمصے میں پڑ گیا۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ سردیوں کی چھٹیاں شروع ہوگئیں اور اس کے ساتھ ہی وہ گھر چلا گیا۔ اُدھر بہار آتے ہی اس کا ٹرانسفر اپنے قصبے سوپور میں ہوا۔ ناگرائے نے بارہمولہ کا گھر تو خالی کر دیا، مگر ہیمال کا دل خالی نہ کر سکا۔ رخصت کے وقت وہ بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا، مگر ہیمال کا کہیں کوئی نام و نشان نہیں مل رہا تھا۔ وہ تیسری منزل پر اسی کے ویران شدہ کمرے کی کھڑکی سے جھانک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہہ رہا تھا۔

دونوں ایک دوسرے کو بھولنے کی کوشش کرنے لگے، مگر بھلا نہیں پا رہے تھے۔ ناگرائے کی راتوں کی نیند غائب ہو چکی تھی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیا کبھی ان کی دوبارہ ملاقات ہوگی بھی یا نہیں؟ اِدھر ہیمال کی حالت بھی دگرگوں تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ دونوں کو پت جھڑ کی ہوا چھو کر گزر گئی ہے۔

ایک سال بیت گیا۔ ان کے لیے تو ایک صدی بیت گئی۔ کہیں سے کوئی امید کی کرن نظر نہیں آ رہی تھی۔

بہر حال عشق کے معاملے میں لڑکیاں زیادہ دلیر اور بے باک ثابت ہوئی ہیں۔ ہیمال نے آخر کار اپنی ماں کو گوش گزار کر لیا۔

ایک سہانی سی صبح نوید لے کر آئی۔ ناگرائے کے گھر میں ہیمال کے والدین تشریف لائے اور بیٹی کی شادی کی بات کر لی۔ دونوں کی شادی ہوگئی۔ ہیمال سوپور میں ایسے رچ بس گئی جیسے وہیں ساری زندگی بسر کی ہو۔ ایک لڑکا سورج اور ایک لڑکی شیتل پیدا ہوئی مگر لڑکی پیدا ہوتے ہی انھیں ہجرت کرنی پڑی۔

شیتل کی تمنّا تھی کہ اس گھر کو دیکھ لے جہاں اس کے والدین کا پیار پروان چڑھا تھا اور پھر اس گھر کو بھی دیکھ لے جہاں اس کی ماں بہو بن کر گئی تھی۔ ماں کی زبان سے اس نے ان دو جگہوں کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا۔ اس کے علاوہ وہ جگہیں دیکھنے کی آرزو بھی تھی جہاں اس کی تہذیب ابھی بھی سرگوشیاں کر رہی تھی۔ اونتی پور اور مارتنڈ کے آثار قدیمہ، ہاری پربت کا قلعہ، شارکا دیوی کا مندر اور پہاڑی کے دامن میں گنیش جی کا مندر اور مخدوم صاحب کی زیارت، شاہ ہمدان، دستگیر صاحب اور چرار شریف کی خانقاہیں، شنکر آچاریہ کا شِو مندر، کھیر بھوانی، ریشی پیر کا استھان، ڈل، ولر اور مانسبل جھیلیں، مغل باغات، چار چنار، سرینگر بارہمولہ سڑک

جس کی دونوں طرف سفیدے کے درخت خوبصورت نظارہ پیش کرتے ہیں اور دور دراز کے صحت افزا مقامات، پہلگام، گلمرگ، سون مرگ اور یوس مرگ۔ اس کے پاس یہ سب کچھ دیکھنے کے لیے بہت کم وقت تھا۔ اس لیے فُل ٹائم ٹیکسی بُک کر کے گھومتی رہی۔

سرینگر کے ہوٹل کے سامنے جب وہ ٹیکسی میں بیٹھ گئی تو ٹیکسی ڈرائیور کو بارہ مولہ جانے کا حکم دیا۔ ڈرائیور نے کہا۔ ''میڈم، اب اسے بارہ مولہ نہیں کہتے ہیں بلکہ 'ورمول' کہتے ہیں۔ سرینگر کو بھی اب 'شہر خاص' اور انت ناگ کو 'اسلام آباد' کہتے ہیں۔

شیتل کے لیے یہ پہلا شاک تھا۔ وہ ڈرائیور سے مخاطب ہوئی ''ہم لوگ آپس میں مل جل کر رہ نہیں سکتے، مگر اپنی بھڑاس ان بے جان اور بے زبان اشیا پر نکالتے ہیں۔ بمبئی کو ممبئی کر لیا، مدراس کو چینئی کر لیا، اورنگ زیب روڈ کو عبدالکلام روڈ کر لیا، کناٹ پلیس کو راجیو چوک بنا لیا اور اب تاج محل کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔''

''ہاں میڈم، یہ کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ لگ رہا ہے۔ ہر جگہ نام بدلنے کی ہوڑ سی لگی ہوئی ہے۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا ہے۔ شنکر آچاریہ کو کوہ سلیمان اور ہاری پربت کو کوہ ماران کہنے لگے ہیں۔ گلی کوچوں کے نام تک بدل دیے گئے۔ کشمیری ناموں کو نظر انداز کر کے عربی ناموں کو ترجیح دی گئی۔ وہ کیا ہے کہ کشمیری میں ایک کہاوت ہے 'پتر حسدِ کور کھتر نآل' (پڑوسی کو نیچا دکھانے کے لیے لڑکی کا ختنہ کرنا)۔ ان سیاست دانوں نے لوگوں کے جذبات سے کھیلنے کے لیے نئے نئے حربے ایجاد کیے ہیں۔ نام بدل لو، تعلیم بدل لو، نصاب بدل لو... نہ جانے اور بھی کیا کیا بدل دیں گے۔''

''تم پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو۔ کیا نام ہے تمھارا؟ کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے؟''

''میڈم، میرا نام عبدالرشید بانڈے ہے۔ ایم اے پاس ہوں۔ بہت کوشش کے باوجود نوکری نہیں ملی۔ خالی اسامیاں بھی تو نہیں ہیں۔ آخر سرکار کہاں تک نوکریاں دیتی پھرے گی۔ پرائیویٹ صنعت کار تو حالات دیکھ کر یہاں آنے سے گریز کرتے ہیں۔ نوکریاں کہاں سے پیدا ہوں گی۔ ہم نے تو اپنی دھرتی کو جہنم بنا کے رکھ دیا ہے۔ تھوڑی بہت نوکریاں جو کچھ بھی دستیاب ہوتی ہیں، وہاں سفارش اور رشوت چلتی ہے۔ دفتر میں کلرک لگنے کے لیے ایک لاکھ کی رشوت مانگتے ہیں۔ اس لیے سوچا اپنی ہی ٹیکسی چلا لوں۔ ابو نے کچھ سرمایہ دیا اور کچھ بینک سے لون لیا۔ گزارا ہو جاتا ہے۔ انشاء اللہ آگے ہوٹل کھولنے کی امید لگائے بیٹھا ہوں۔''

بارہ مولہ پہنچ کر رشید اس کو ہیمال کا میکا دکھانے کے لیے لے گیا۔ جہلم کے کنارے وہ تین منزلہ مکان ابھی بھی اپنی آب و تاب کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہی پرانی وضع قطع کا مہاراجی انیٹوں کا بنا ہوا مکان، بیشتر حصے میں نقش کی ہوئی دیودار لکڑی استعمال ہوئی تھی، جالی دار کھڑکیاں اور آگے کو نکلی ہوئی بالکونیاں جن میں کئی رنگ کے شیشے لگے ہوئے تھے۔ تیسری منزل میں لکڑی کی بنی ہوئی ایک لمبی شہ نشین تھی، کھڑکیوں میں سرکواں جھلملیاں لگی ہوئی تھیں جن کو قبضوں پر جھولنے کے بجائے کھسکا کر کھولا یا بند کیا جاتا تھا۔ جونہی موجودہ مکینوں کو شیتل کے آنے کی خبر ملی وہ سبھی آؤ بھگت کے لیے باہر آئے، عورتیں گلے ملیں اور اس کے پوروجوں کی تعریفیں کرنے لگیں۔ آدھ پون گھنٹے میں اس کے سامنے دسترخوان بچھ گیا جس پر سماوار میں نمکین دودھ والی چائے اُبل رہی تھی۔ ساتھ میں شریمال، ژوچ وَر، کلچے اور باقر خانیاں سجی ہوئی تھیں۔ شیتل ان کے بے انتہا پیار کو دیکھ کر جذباتی ہوگئی۔ اسے اپنی ماں کی باتیں یاد آگئیں کہ ہم لوگ آپس میں بہت ہی پیار اور محبت سے رہتے تھے۔ تاہم اس کو کچھ اضطراب سا تھا جس کا احساس خاتون خانہ کو ہوا۔ پوچھنے لگی۔

''بیٹی کچھ دیکھنا چاہتی ہو، تو بتاؤ، یہاں کچھ بھی نہیں بدلا ہے۔''

''ہاں آنٹی، ماں کہتی تھی کہ وہاں آنگن میں ایک بہت بڑا ڈیڑھ سو سال پرانا چنار ہے جو کنواری لڑکیوں کی منتیں پوری کرتا ہے۔ میری ماں نے بھی اس چنار سے منت مانگی تھی اور وہ پوری بھی ہوئی تھی۔ چنار کے پاس دو تین بادام اور اخروٹ کے درخت بھی ہیں۔''

سامنے کھڑے ہوئے لوگ ایک دوسرے کے منہ تکنے لگے۔ انھیں کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ آخر کار مالکہ نے خود کو سنبھال کر جواب دیا۔

''بیٹی، وہ بوڑھا چنار کھوکھلا ہو چکا تھا۔ ایک روز تند و تیز آندھی کی تاب نہ لا کر زمین پر دھڑام سے گر گیا۔''

''گر... گیا...! یعنی اب وہ وہاں پر نہیں ہے...! مطلب ہیمال کے دور کا انت ہو چکا ہے...!'' شیتل کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ وہ ماں کے اس چنار کو نہیں دیکھ پائی جس کے بارے میں وہ روزانہ کچھ نہ کچھ ماں سے سنتی آئی تھی۔ اس کے بعد وہ کچھ دیر کے لیے جہلم دریا کے کنارے پر ٹہلتی رہی اور اس زندگی کو جینے کی کوشش کرنے لگی جو اس کی ماں نے اس قصبے میں گزاری تھی۔

شیتل کا دوسرا پڑاؤ سوپور کا گھر تھا جہاں اس کا باپ رہتا تھا۔ بارہ مولہ کے برعکس سوپور بہت ہی ترقی یافتہ قصبہ ہے جسے لوگ 'مشرق کا

پیرس' کہتے ہیں۔ میوہ جات کے باغات نے اس قصبے کی اقتصادی حالت کو اتنا خوشحال بنایا ہے کہ دیکھتے ہی بنتا ہے۔ نئے مکانات، نئے مال، نئے بازار.....اس کو تعجب ہو رہا تھا۔ عبدالرشید نے شیتل کے بتائے ہوئے پتے پر ٹیکسی روک لی، مگر وہاں تو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ سڑک کے کنارے ایک بہت بڑا مال تعمیر ہو چکا تھا۔ اس نے پاس ہی ایک دکان دار سے پوچھ لیا۔

''جناب یہاں اس ایڈریس پر ایک مکان تھا، وہ کہاں ملے گا۔''

رشید نے ایڈریس کی پرچی سامنے کر لی۔

دکان دار نے تھوڑی دیر اس کو سر سے پاؤں تک دیکھ لیا اور پھر جواب دیا:

''بھائی کس زمانے کی بات کر رہے ہو۔ یہ علاقہ دو بار نذرِ آتش ہوا تھا۔ بیسیوں مکانات جل کر خاک ہو گئے تھے۔ کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ بہت برس گزر جانے کے بعد معلوم ہوا کہ کسی مقامی سرمایہ دار نے یہاں سڑک کے ساتھ ساتھ کئی زمینیں خرید لی ہیں اور پھر اس پر یہ مال کھڑا کر لیا۔ کوئی موروثی امیر نہیں تھا، مگر سنا ہے کہ اس نے نامساعد حالات کا فائدہ اٹھا کر املاک کی تجارت اور منشیات کا کاروبار کر کے بہت دولت کمالی۔ اب تو اس کی خلیجی ممالک میں تین دکانیں ہیں۔ وہاں قالینوں کا کاروبار کرتا ہے۔

شیتل اپنا سا منہ لے کر واپس چل پڑی۔ واپسی پر ولر کے کنارے کچھ دیر رکی اور پھر کھیر بھوانی سے ہوتے ہوئے مانسبل جھیل کا بھی نظارہ کیا۔ آج نہ جانے کیوں اسے سب کچھ اُجڑا اُجڑا سا لگ رہا تھا۔ دراصل جیسی ذہنی حالت ہوتی ہے ویسی ہی دنیا نظر آتی ہے۔

راستے میں رشید گویا ہوا۔'' میڈم، ان باتوں کو دل پر نہیں لینا چاہیے۔ تخریب اور تعمیر دونوں انسانی سرشت کا حصہ ہیں۔ تہذیبیں بنتی ہیں، بگڑتی ہیں۔ تعمیری انسان اپنی تخلیقی صلاحیت کا اظہار شہروں کو بسا کر، عمارتوں اور باغات کو بنا کر یا پھر مجسموں کو تراش کر کرتا ہے جب کہ تخریبی انسان ان تخلیقات کو تہس نہس کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالتا ہے۔ یہاں گزشتہ کئی سالوں سے یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔''

واپسی پر ٹیکسی شہر خاص میں جس سڑک پر جا رہی تھی اس کے بارے میں رشید نے اسے بتایا۔

''ایک زمانہ تھا کہ اس سڑک کے بدلے یہاں ایک نہر تھی جس کو نالہ مار کہا جاتا تھا۔ پرانے زمانے میں بادشاہوں نے جگہ جگہ کھیتوں کو سیراب کرنے اور پانی کی نکاسی کے لیے نہریں کھدوائی تھیں، مگر خود غرض جمہوری سیاست دانوں اور غاصبِ اراضی نے شہر کی ان شریانوں کا وجود ہی ختم کر دیا۔ انھوں نے نالہ مار کو صفحۂ ہستی سے ہی مٹا دیا۔ اب تو آئے دن شہر کو سیلاب بہا کر لے جاتا ہے اور لوگ بے بس دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ ان شریانوں پر بنی ہوئی یہ عمارتیں سیلاب کے دنوں میں ہاتھ پاؤں مارتی رہتی ہیں۔''

ٹیکسی شیتل کے ہوٹل کے سامنے رک گئی اور وہ بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ بے دلی سے ڈنر کھایا اور پھر سونے کی کوشش کرنے لگی، مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

دوسرے روز اس نے ہوائی جہاز کی سیڑھی کے آخری پائیدان سے وادی کے منظر کو ایک آخری بار نگاہوں میں سمیٹنے کی کوشش کی اور ہوا میں ہاتھ لہرا کر الوداع کہا۔ پھر فضا میں انڈیگو ائیر لائنز کی اُڑان کے ساتھ اُڑتی چلی گئی۔

○○

مونوگراف حضرت وارث شاہ

وارث شاہ جنھیں بجا طور پر پنجابی زبان، پنجابی شاعری اور پنجابی ثقافت، تہذیب و تمدن کا وارث کہا جاتا ہے، ان پر یہ مونوگراف بھرپور روشنی ڈالتا ہے۔ اس میں وارث شاہ کے حالاتِ زندگی بھی بھرپور تحقیق و توجہ کے ساتھ شامل کیے گئے ہیں۔ ہیر رانجھا کی کہانی کو اسی پیرائے میں پیش کیا گیا ہے جس میں وارث شاہ نے اسے تحریر کیا تھا تاکہ اس عظیم شاعر کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑ سکے۔

مصنف: رتن سنگھ، صفحات: ۱۳۶، قیمت: ۴۵ روپے

ناشر: اردو اکادمی، دہلی